اپنے مفادات سے متعلق دھیما رویہ اختیار کرتے ہوئے سوویت یونین سے متوقع طور پر آزادی حاصل کرنے والی ریاستوں (بشمول رشین فیڈریشن) کے ساتھ مضبوط بنیادوں پر تعلقات کے قیام پر توجہ مرکوز کرنا شروع کردی۔ تہران بیک وقت اس پر مسلط کردہ "تنہائی" کا مداوا بھی کرنا چاہتا تھا اور خطے میں مغرب نواز اتحاد کے مقابلے میں ایک نئی دھڑے بندی (counterpoise) کی تشکیل کا بھی خواہاں تھا۶۔

یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ایران کی شروع سے خواہش (اور کوشش) رہی ہے کہ سابق سوویت مسلم ریاستوں کے ساتھ تعلقات کے سلسلہ میں کوئی بھی ایسا قدم نہ اٹھایا جائے جس سے ماسکو کی ناراضگی مول لینا پڑے۔ ایران کو خطے میں ماسکو کی مرکزی حیثیت کا پوری طرح احساس ہے اور وہ ماسکو کے مفادات سے متضاد کوئی بھی قدم اٹھانے سے ہمیشہ سے احتراز کرتا رہا ہے۔

خطے سے متعلق ایرانی خارجہ پالیسی کے عناصر تکوینی

وسطی ایشیا اور سابق سوویت یونین کی دیگر ریاستوں سے متعلق ایرانی خارجہ پالیسی متعدد جہات کی حامل ہے۔ اولاً اس پالیسی کا اہم ترین عنصر ملکی اور علاقائی سلامتی کا تحفظ ہے۔ ۱۹۹۱ء میں خلیجی جنگ کے نتیجے میں خطے میں ایران مخالف مغربی طاقتوں کی مستقل موجودگی اور سوویت یونین کے خاتمے کے بعد شمال میں ایک پڑوسی ملک (سوویت یونین کے بجائے متعدد ممالک) کے ظہور نے ایران کو سلامتی کے ایک ناخوشگوار ماحول سے دوچار کیا۔ اس کی شمالی سرحدوں پر سات نئی ریاستوں کا ظہور ہوا۔ جن میں سے ایک (آرمینیا) صرف خشکی کے ذریعے اس سے متصل تھی جبکہ دو (ترکمنستان اور آذربائیجان) کی سرحدیں خشکی کے ساتھ ساتھ بحیرہ کیسپین کے سواحل کے ذریعے بھی اس سے متصل تھیں۔ دو دیگر ریاستوں (رشین فیڈریشن اور قازقستان) کی سرحدیں بحیرہ کیسپین کے ذریعے اس سے متصل تھیں۔ ایران ان نوآزاد ممالک میں مسلح تنازعات والے علاقوں (trouble spots) سے قریب ترین ملک ہے۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد نو آزاد وسطی ایشیائی ریاستوں اور قفقاز میں سیاسی عدم استحکام کی جو صورت حال سامنے آئی اس سے ایران - وسطی ایشیائی ریاستوں کے تعلقات میں سلامتی سے متعلق عنصر کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ ایران کی سرحدوں پر واقع ان ریاستوں میں سوویت یونین کے انہدام کے بعد قومی تعمیر (nation building)، معاشرتی اور اقتصادی بحالی، استعماری ورثے سے نجات، لسانی اور نسلی

تعصبات پر قابو پانے اور سرحدی تنازعات کے تصفیوں سے متعلق جو مسائل اور مشکلات ابھر کر سامنے آئیں' ایران کے لیے ان کے اثرات سے اپنے آپ کو بچانا اہم ترین مسئلہ تھا۔ مثلاً" ایران کے پڑوسی ممالک آذربائیجان اور آرمینیا کے درمیان نگورنو کارا باخ کے تنازعہ کے سلسلہ میں متوقع بیرونی مداخلت اور اس کے نتیجے میں ایران کے اپنے آذری علاقوں میں پناہ گزینوں کی متوقع آمد کے منفی سیاسی اور اقتصادی اثرات' ایران کی داخلی سلامتی سے متعلق مسائل کا باعث بن سکتے تھے۔ سلامتی سے متعلق ایران کی تشویش کا ایک اور پہلو سوویت یونین کے انہدام کے بعد تشکیل دی جانے والی "آزاد ممالک کی دولت مشترکہ" کے فوجی مستقبل سے متعلق ابہام تھا۔ کیا آزاد ممالک کی دولت مشترکہ میں شامل ہر ملک کو اپنی فوج رکھنے کا اختیار ہوگا یا ایک مشترکہ فوج کو ان ممالک کی سرحدوں کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی جائے گی؟ یہ سوالات ایرانی دفاعی حکمت کاروں کے لیے انتہائی تشویش کا باعث بنے ہوئے تھے۔ نو آزاد مسلم ریاستوں میں اسلامی احیاء کی تحریکوں کے حوالے سے ایران کو یہ پریشانی لاحق تھی کہ مغرب اور امریکہ کی طرف سے "اسلامی انقلاب کی برآمد" کے ذریعے پڑوس کے اسلامی ممالک میں عدم استحکام پیدا کرنے کا ذمہ دار ٹھہرانے کی جو منظم مہم ایران کے خلاف چلائی جارہی ہے' کہیں نو آزاد مسلم ریاستیں اس سے متاثر ہو کر ایران کے لیے منفی رویہ نہ اختیار کرلیں۔ ان نو آزاد مسلم ریاستوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات ایران کی ضرورت تھی۔ لیکن اس سے بھی اہم بات ایران کے لیے یہ تھی کہ ان ریاستوں کے ساتھ تعلقات کے قیام کے حوالے سے ماسکو کی اشیرباد حاصل کی جائے۔ امریکہ سے دشمنی کے ساتھ ساتھ ایران ماسکو کی ناراضگی کا متحمل نہیں تھا۔ اسے عراق کے ساتھ آٹھ سالہ جنگ کے نتیجے میں اپنے تباہ شدہ فوجی اور اقتصادی ڈھانچوں کی تعمیرنو کے لیے ماسکو کے تعاون کی ضرورت تھی۔ ۱۹۸۹ء میں ایران نے سابق سوویت یونین کے ساتھ دس بلین ڈالر کے اسلحہ کی خریداری کا معاہدہ کیا تھا۔ ایران کی شدید خواہش تھی کہ ماسکو کو اس معاہدہ کو منسوخ کرنے کا کوئی بہانہ مہیا نہ کیا جائے۷۔ ایران کو اپنی جوہری تنصیبات کی تکمیل کے لیے بھی روسی تعاون کی ضرورت تھی چنانچہ اس کے لیے وسطی ایشیا میں اپنے مفادات کے حصول کے ساتھ ساتھ ماسکو کی حساسیت (senstivities) کا خیال رکھنا انتہائی ضروری تھا۔

نو آزاد مسلم ریاستوں سے متعلق ایرانی پالیسی کا ایک اور اہم عنصر اقتصادی تعاون کے منصوبوں کے ذریعے خطے کی اقتصادی بحالی میں ایران کے لیے ایک مرکزی کردار کا حصول ہے۔ نو آزاد مسلم ریاستوں کو سوویت یونین کے انہدام کے نتیجے میں گوناگوں اقتصادی مشکلات کا سامنا

ہے۔ اگرچہ یہ ریاستیں قدرتی دولت سے مالا مال ہیں تاہم سوویت دور کے مرکزیت پسند اقتصادی نظام کے خاتمے کے بعد اقتصادی میدان میں انہیں ایک ایسے خلا کا سامنا ہے جس میں ایک طرف تو انہیں اپنے اقتصادی ڈھانچوں کی تعمیر کے لیے بیرونی امداد اور سرمایہ کاری کی ضرورت ہے اور دوسری طرف بیرونی دنیا کے ساتھ تجارتی روابط کے قیام کے لیے گذر گاہوں کی ضرورت ہے۔ ایران ان مسلم ریاستوں کے ساتھ مضبوط اقتصادی روابط کے قیام اور انہیں اپنے قدرتی وسائل بیرونی منڈیوں تک پہنچانے کے لیے گذر گاہوں کی فراہمی کے ذریعہ خطے کی اقتصادی خوشحالی میں کردار ادا کرنے کا خواہش مند ہے۔ نو آزاد ریاستیں ایران کی زرعی اور صنعتی مصنوعات کے لیے ایک زبردست مارکیٹ بن سکتی ہیں۔ تیل، گیس، پیٹرو کیمیکل اور ہلکی صنعتوں کے قیام میں ایران کی صلاحیت اور وسائل سے یہ ریاستیں کافی حد تک استفادہ کرسکتی ہیں۔ ایرانیوں کے مطابق "وسطی ایشیا کی یہ نو آزاد ریاستیں آٹھ سے دس بلین ڈالر تک (سالانہ؟) ایرانی برآمدات کی منڈی بن سکتی ہیں"۸۔

نو آزاد مسلم ریاستوں سے متعلق ایرانی خارجہ پالیسی کا ایک تیسرا اہم عنصر اسلامی بھائی چارے کو فروغ دینا ہے اور ان ریاستوں اور ان کے عوام کے مسلم تشخص کو فروغ دینا ہے۔ اس حوالے سے مغربی پریس میں ایران کی وسط ایشیائی ریاستوں میں سرگرمیوں پر خاصی تشویش کا اظہار کیا گیا۔ بہرحال ایران ایک حد تک ماسکو اور نو آزاد مسلم ریاستوں میں حکمران سابق کمیونسٹوں کے ان خدشات کو دور کرنے میں کامیاب رہا ہے کہ وہ ان ریاستوں میں اسلامی بنیاد پرستی کی سرپرستی کرکے سیاسی عدم استحکام پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس ایران ان ریاستوں میں امریکی اور اسرائیلی (اور کسی حد تک ترکی کی) سرگرمیوں سے خائف ہے۔ اسرائیل خاص کر ان ممالک میں ایرانی اثر و نفوذ روکنے کے لیے سرگرم عمل ہے۔ ایرانی خبررساں ایجنسی ارنا (IRNA) کی رپورٹوں کے مطابق اسرائیل کے سراغرساں ادارے کے اہل کار آذربائیجان کی خفیہ ایجنسیوں کے اہل کاروں کو تربیت دینے کے لیے باکو پہنچ گئے ہیں۔ خود اسرائیلیوں کے مطابق "آذربائیجان کے ساتھ مضبوط تعلقات اسرائیل کے تزویراتی مفادات کا تقاضا ہے۔ اسرائیل کے لیے ان تعلقات کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ یہ ایران سے اٹھنے والی اسلامی بنیاد پرستی کی لہر کو آذربائیجان تک پہنچنے سے روکنے میں مد ثابت ہوسکتے ہیں"۹۔

نو آزاد مسلم ریاستوں کے ساتھ ایران مضبوط تاریخی، ثقافتی رشتوں میں منسلک ہے۔ ایران اس مشترک ثقافتی ورثے کو بھی خطے میں اپنا اثر و نفوذ بڑھانے کے لیے استعمال کر رہا ہے اور یہی

خطے سے متعلق اس کی خارجہ پالیسی کا چوتھا اہم عنصر ہے۔ تاجکستان کے ساتھ اگرچہ ایران کا براہ راست جغرافیائی تعلق اور اتصال نہیں تاہم دونوں ممالک میں بولی جانے والی بولیاں تاجک اور فارسی تقریباً" ایک ہیں۔ دونوں کا ثقافتی ورثہ مشترک ہے اور دونوں ماضی میں ایک ہی سلطنت کا حصہ رہ چکے ہیں۔ ۲۸ سے ۳۰ جون ۱۹۹۲ء تک ایران کے سرکاری دورے سے واپسی پر تاجک صدر رحمٰن نبی یوف نے کہا تھا:

> We and the Iranians have a single language, a single faith; we have a single science and culture. Moreover, right up to the 15th Century we and they lived in a single state:10

زمانہ قدیم سے وسطی ایشیا میں لفظ تاجک ان لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے جو ترکی کے بجائے فارسی زبان بولتے تھے۔ لیکن سیاسی معنوں میں ایک مخصوص قومیت کے لیے لفظ تاجک کا استعمال بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں سوویت حکمرانوں کی ایجاد ہے۔ سوویت حکمرانوں کی طرف سے وسط ایشیائی مسلمانوں کو لسانی اور نسلی بنیادوں پر چھوٹی چھوٹی قومیتوں میں تقسیم کرکے مخصوص علاقائی حد بندیوں کے ساتھ انہیں الگ الگ جمہوریتوں میں تقسیم کرنے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی شعبوں میں نسلی (اور لسانی) خصوصیات (ethnicity) کو بہت زیادہ وزن دیا جانے لگا۔ چنانچہ اس تناظر میں تاجکستان کے اشرافیہ اور دانشور طبقوں کی طرف سے گذشتہ نصف صدی کے دوران سوویت یونین سے باہر فارسی بولنے والوں کے ساتھ اپنے لسانی اور ثقافتی روابط سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا رجحان منظر عام پر آیا۔ سوویت حکام اور دیگر وسط ایشیائی (ترک) قومیتوں کی طرف سے تاجکوں کی شناخت سے متعلق توہین آمیز رویہ اختیار کیا جاتا تھا۔ اس رویے کے ردعمل کے طور پر تاجکوں میں فارسی تہذیبی ورثے کو اپنانے اور فارسی اور تاجک زبانوں کو ایک ہی زبان (کے دو مختلف لہجے) قرار دینے کا رواج عام ہونے لگا۔ ماسکو کی طرف سے تمام وسط ایشیائی قومیتوں کو "سابقہ پسماندہ قومیتیں formerly backward peoples) قرار دینے کے جواب میں تاجک دانشور اور حتیٰ کہ مقامی کمیونسٹ حکام یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ ان کا تعلق ایک ایسی تہذیب سے ہے جو نہ صرف انتہائی ترقی یافتہ ہے بلکہ جس نے زمانہ قدیم میں دنیا کی ایک عظیم سلطنت کو جنم دیا۔ تاجکوں کی اپنی فارسی شناخت سے گہری وابستگی کا اظہار ۱۹۸۹ء میں تاجک حکومت کی طرف سے تاجک (فارسی) کو سرکاری زبان قرار دینے سے ہوا۔ اس سلسلے میں جس قانون کا اجراء ہوا اس میں تاجک اور

فارسی کو ایک ہی زبان قرار دیا گیا مزید یہ کہ اس قانون کی رو سے تاجک زبان کے لیے عربی / فارسی رسم الخط اختیار کرنے کی تجویز پیش کی گئی[۱۱]۔ تاجکستان کی آزادی کے پہلے سال کے دوران ہی تاجک زبان اور تاجک لٹریچر کے لیے تاجک کے بجائے فارسی کے لفظ کے استعمال کا رواج عام ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسری وسط ایشیائی ریاستوں کی طرح تاجکستان میں قوم پرستی کے رجحانات زور پکڑنے لگے۔ ماسکو کے ساتھ سابقہ طرز کے مرکز۔ علاقائی (centre – perephery) تعلقات کے خاتمہ کے بعد پیدا شدہ خلا کو پر کرنے کے لیے قدرتی طور پر تاجکوں کی نظر ایران کی طرف اٹھنے لگی۔ تاجک سمجھتے ہیں کہ ایران کے ساتھ قریبی تعلقات ان کے لیے متعدد شعبوں میں انتہائی مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ بہرحال ایران کے ساتھ مضبوط رشتوں کے قیام کی تاجک کوششوں میں تاجک ثقافتی احیاء کو اہم مقام حاصل رہا ہے۔ تاجک بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ ۱۹۲۹ء میں تاجک زبان کے لیے عربی / فارسی رسم الخط ترک کرنے کے سوویت فیصلے کے ذریعے ان کا رشتہ اپنے بھرپور ثقافتی ورثے سے کاٹ دیا گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں ان کا اپنے ہم زبان ایرانیوں سے (کم از کم کتابت کی حد تک) ہم کلام ہونا مشکل ہوگیا ہے۔ مزید یہ کہ تاجکوں کو فارسی لٹریچر کی ان معدودے چند کتابوں کے علاوہ جو سوویت حکام نے سریلیک رسم الخط میں چھپوائیں، عربی / فارسی رسم الخط سے نابلد ہونے کی بنا پر اپنی ہی زبان میں بیرون ملک چھپنے والی گراں مایہ تخلیقات سے مستفید ہونے کی صلاحیت سے محروم کردیا گیا ہے۔ اس پس منظر میں تاجکوں کی شدید خواہش ہے کہ وہ اپنی زبان کے لیے پھر سے فارسی / عربی رسم الخط اختیار کریں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ سوویت دور کے تعلیم یافتہ نوجوان (اور بوڑھے) عربی / فارسی رسم الخط سے قطعاً نابلد ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں نئی لسانی پالیسی کے اجراء کے تین سال بعد عربی / فارسی رسم الخط اپنانے کے ایک حامی کے اندازے کے مطابق ملک کی آبادی کا صرف ایک فیصد عربی / فارسی رسم الخط میں فارسی پڑھنے اور لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے[۱۲]۔

تاجک زبان رہی کے لیے عربی / فارسی رسم الخط اختیار کرنے اور اس سلسلے میں ایران کا تعاون حاصل کرنے میں تاجکوں کو بعض مشکلات کا بھی سامنا ہے۔ ایران اور ایرانیوں کے ساتھ وسعت پذیر تعامل (Interaction) کے نتیجے میں تاجک زبان میں نئے الفاظ، نئی تراکیب اور اصطلاحات متعارف ہو رہی ہیں، جو ایرانی فارسی سے نابلد تاجکوں کے لیے مشکلات کا باعث بن رہی ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ روسی زبان سے مستعار لی گئی اصطلاحات اور تراکیب کو ترک کرکے خالص ایرانی فارسی کو رواج دینا چاہیے جبکہ بعض دیگر روس نواز عناصر اس تجویز کی

سختی سے مخالفت کر رہے ہیں۱۳۔ ان کا خیال ہے کہ ایرانی فارسی بھی کلاسیکی زبان نہیں رہی ہے بلکہ اس کے اندر بھی مشرقی ایران اور دیگر علاقوں کی زبانوں کے الفاظ و تراکیب در آئے ہیں۔ ملک کے اندر ایسے (خصوصاً سیکولر) طبقے بھی ہیں جو اپنے لئے فارسی شناخت کے بجائے اپنی قدیم سغدی (یا سغدی۱۴) تہذیب کے احیاء کی وکالت کر رہے ہیں اس مقصد کے حصول کے لیے بعض تاجک اصلاحات پسندوں نے ایک تنظیم "سغدیانہ" کے نام سے (۱۹۸۹ء میں ہی) قائم کرلی تھی۱۵۔ بہرحال دونوں ممالک کے مابین براہ راست جغرافیائی اتصال کی عدم موجودگی کے باوجود ثقافتی' لسانی اور (مسلکی نہ سہی) مذہبی ہم آہنگی نزدیکی روابط اور قریبی تعلقات کے لیے ایک اہم بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

آذربائیجان ایک اور ایسا ملک ہے جس کے ساتھ ایران کے قریبی ثقافتی تعلقات کے قیام کے امکانات روشن ہیں۔ آذربائیجان خشکی کے راستے اور بحیرہ کیسپین کے سواحل کے ذریعے ایران سے متصل ہے۔ آذری ترک ایران کے (صوبہ) آذربائیجان میں بھی آباد ہیں۔ آذربائیجان (اور جارجیا و آرمینیا) ایک اکائی کی صورت میں نادرشاہ کے عہد تک (م ۱۷۴۷ء) سلطنت ایران کا حصہ تھا۔ نادرشاہ کے قتل کے بعد شہزادوں میں تخت ایران پر قبضے کے لیے جو رسہ کشی شروع ہوئی اس کی وجہ سے خراسان اور افغانستان نے آزادی کا اعلان کردیا اور جارجیا کے شہزادوں تماراس اور ہرکولیس نے ایرانی بالادستی کا طوق اتار پھینکتے ہوئے پہاڑی قبائلیوں کے حملوں سے بچاؤ کے لیے ماسکو سے امداد و تعاون کی درخواست کی۔ ہرکولیس نے جولائی ۱۷۸۳ء میں روس کے ساتھ الحاق معاہدہ پر دستخط کرکے ملکہ کیتھرین کی محکومی قبول کی۔ ۱۷۹۵ء میں ایران کے آغا محمد شاہ نے ساٹھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج کے ساتھ ہرکولیس کی راج دہانی تفلس پر حملہ کیا۔ آغا محمد نہ صرف تفلس میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا بلکہ اریوان (اب ریوان) پر بھی اس کی افواج نے قبضہ کر لیا۔ آغا محمد شاہ کی ان کامیابیوں سے ایک بار پھر پورے قفقاز پر ایرانیوں کی بالادستی قائم ہوگئی۱۶۔

آغا محمد شاہ کی اس کارروائی کے جواب میں زارینہ کیتھرین دوم نے کاونٹ ویلریان زوبوف کی قیادت میں روسی افواج کو قفقاز کی طرف پیش قدمی کے لیے روانہ کیا۔ ۱۷۹۶ء سے ۱۸۱۳ء تک خطے پر سیادت کے لیے ایرانی اور روسی افواج میں متعدد معرکے لڑے گئے' جن میں روسیوں کا پلڑہ بھاری رہا۔ بالآخر ۱۸۱۳ء میں دونوں ممالک کے مابین معاہدہ گلستان' پر دستخط ہوئے جس کی رو سے ایرانیوں نے "کاراباخ"' جارجیا کے صوبوں اور شروان' کوبا' دربند' داغستان' تالیش کے

روسی مقبوضہ علاقوں' منگریلیا اور قفقاز کے دیگر علاقوں پر روسی حاکیت تسلیم کر لی۔ اس معاہدہ میں روس اور ایران کے درمیان بعض سرحدی علاقوں میں سرحدوں کا درست اور حتمی تعین نہیں کیا گیا تھا۔ اس سقم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے روسیوں نے ۱۸۲۵ء میں ضلع گوکچہ پر قبضہ کر لیا۔ ایرانیوں کا ردعمل بہت شدید تھا۔ اس علاقے پر اس سے قبل عملاً" ایران کی عملداری تھی۔ روسیوں کی اس کارروائی نے پورے ایران میں شدید عوامی اضطراب پیدا کیا۔ علماء اور عوام نے روسی توسیع پسندوں کے خلاف حکومت پر فوجی کارروائی کے لیے زبردست دباؤ ڈالا۔ چنانچہ ولی عہد شاہزادہ عباس مرزا کی قیادت میں ملک کے کونے کونے سے مسلح افراد اکٹھے ہوئے۔ عباس مرزا کی قیادت میں ایرانی افواج نے مذہبی جوش و خروش اور ملی جذبات کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ہی ہلے میں روسیوں کو ان تمام علاقوں سے پیچھے دھکیل دیا جو معاہدہ گلستان کے تحت روسی عملداری میں دے دیے گئے تھے۔ لیکن جلد ہی جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور روسیوں کی زبردست فوجی طاقت کے سامنے ایرانیوں کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ نتیجتاً" ایرانیوں کو روسیوں کی شرائط پر (ایران میں برطانوی سفیر کی وساطت سے) ۱۸۲۸ء میں ایک اور معاہدہ پر دستخط کرنا پڑے جسے معاہدہ ترکمانچائی کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کی رو سے ایرانیوں نے ایریوان اور نخچیوان پر بھی روسی بالادستی کو قبول کر لیا۔ اور یوں قفقاز کے پورے علاقے کو روسیوں کے سپرد کرنے کے علاوہ ایران نے آذربائیجان کے شمالی حصے پر بھی روسیوں کے اقتدار کو تسلیم کر لیا۔ جنوبی آذربائیجان (جو ایران میں شامل ہے' میں آباد آذری ایران کی سب سے بڑی لسانی اقلیت ہیں۱۷۔ ایرانی آذربائیجان میں آذریوں کی تعداد (۸۰ کی دہائی کے اندازوں کے مطابق) ۴۵ لاکھ سے ۶۰ لاکھ تک تھی۱۸۔

۱۹۱۷ء کے بالشویک انقلاب کے بعد روسیوں کے زیر قبضہ دیگر علاقوں کے مسلمانوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آذریوں نے ماسکو سے آزادی کا اعلان کیا مگر جلد ہی سوویت حکام نے ان کی یہ آزادی سلب کر لی اور آذربائیجان کو سوویت سوشلسٹ ری پبلک بنا دیا گیا۔ زبان' مذہب اور نسل کے حوالوں سے آذریوں میں اپنی شناخت کے لیے مختلف رجحانات پائے جاتے ہیں۔ گو نسل اور زبان کے حوالوں سے آذری ترکی کے قریب تر ہیں' لیکن مذہبی شناخت (شیعہ) اور علاقائی حوالوں سے آذربائیجان کی عام آبادی میں ایران سے وابستگی کے رجحانات خاصے مضبوط ہیں۱۹۔ ترک شناخت کے حوالے سے بعض ترقی پسند آذری دانشور ترکی کو اپنا آئیڈیل سمجھتے ہیں۔ جبکہ بعض ایسے عناصر بھی ہیں جو انیسویں صدی کے اوائل اور بیسویں صدی کے اواخر میں تاتار

اصلاحات پسندوں کی پان ترکزم اور پان اسلامزم تحریکات (جدید موومنٹ) سے متاثر ہیں۔ بہرحال آذری عام طور پر اپنی شناخت' ثقافت اور تاریخ کے لحاظ سے کاملاً" ایرانی ہیں۲۰۔ ایران کی آذری آبادی کی اکثریت مشرقی اور مغربی آذربائیجان کے صوبوں میں آباد ہے۔ تہران اور آذربائیجان کے درمیان ستر دیہات میں ان کی آبادیاں ہیں۔ تقریباً" ۵۰ فیصد مرد اور ۲۵ فیصد عورتیں اپنی مادری زبان کے علاوہ فارسی بولتی ہیں۔ آذری ایران کے سیاسی نظام میں ہمیشہ موثر رہے ہیں۔ صفوی دور (۱۵۰۱ء - ۱۷۲۲ء) میں آذری "شاہ سیوان"۲۱ (قبیلے) کو خصوصی درجہ حاصل تھا۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے صفوی بادشاہوں کے مخالفین کو مطیع و فرمانبردار بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ شاہ عباس صفوی نے ۱۶۰۰ء کے لگ بھگ شاہ سیوان کو الگ شناخت دی۔ اس طرح آذری قاچار دور میں بھی نمایاں رہے۔ ایران کی انقلابی حکومت کے پہلے وزیراعظم مہدی بازرگان' (ایرانی) آذربائیجان کے پہلے گورنر رحمت مقدم اور آیت اللہ شریعت مداری آذری الاصل تھے۲۲۔

ایران کے ساتھ مشترک ثقافتی ورثے کی حامل جس دیگر وسط ایشیائی مسلم ریاست کی زمینی اور سمندری سرحدیں ملتی ہیں' وہ ترکمنستان ہے۔ خشکی کے ذریعے ایران کی طویل ترین سرحد اسی نو آزاد مسلم ریاست سے ملتی ہے۔ جمہوریہ ترکمنستان کا نام ترک قبیلے ترکمن یا ترکمان کے سبب ہے جو جمہوریہ کی ۳۸ لاکھ آبادی (۱۹۹۲ء) میں اکسٹھ فیصد سے زائد ہے۔ سابق سوویت یونین کی دیگر جمہوریاؤں میں ترکمن اقلیتوں کی موجودگی کے علاوہ ترکمنوں کی ایک کثیر تعداد افغانستان' ایران (اور عراق) میں بھی آباد ہے۔ ایران میں ترکمنوں کی آبادی چار لاکھ کے قریب ہے۲۳۔ ترکمن ایران میں آباد اہم قوموں میں شامل ہے اور یہ صوبہ خراسان کے شمال میں صحرائے ترکمن میں زندگی گزارتی ہے۔ یہ قوم ظاہری چہرے مہرے کی بناوٹ' زبان اور مادی ثقافت کے لحاظ سے دوسری ایرانی قوموں سے بالکل مختلف ہے۲۴۔ ترکمنوں۲۵ کا تعلق اوغوز ترک نسلی گروہ سے ہے۔ زبان اور لہجے کے لحاظ سے ترکمن دیگر وسط ایشیائی ترک قومیتوں کی نسبت اناطولیہ (ترکی) اور آذربائیجان کے ترکوں کے قریب تر ہیں۲۶۔ اوغوز ترکمن قبائل آٹھویں صدی عیسوی میں سیر دریا اور بحیرہ آرال کے شمال میں آباد ہوئے۔ اسلامی فتوحات کے بعد اس علاقے کی عظیم تر اسلامی سلطنت میں شمولیت کے بعد ترکمن قبائل جنوب میں ایران اور مشرقی وسطی کے علاقوں تک پھیل گئے۔ اوغوز ترکمن نسل کے سردار سلجوق کے پوتے طغرل بیگ نے اپنے دادا کے علاقائی مقبوضات میں توسیع کرتے ہوئے ۱۰۴۰ء میں موجودہ ترکمنستان کے جنوبی

حصوں اور قفقاز میں سلجوق سلطنت کی بنیاد رکھی جس کا دارالسلطنت مرو تھا۔ ۱۰۵۵ء میں طغرل بیگ بغداد میں داخل ہوا اور خلافت کے محافظ کی حیثیت سے اسلامی قلمرو کے اکثر علاقوں کو زیر نگیں کر لیا۔ طغرل کے بھتیجے الپ ارسلان نے ۱۰۷۱ء میں مالازگرد کے مقام پر بازنطینی افواج کو شکست دیکر عثمانی ترکوں کے لیے ایشیائے کوچک فتح کرنے کا راستہ ہموار کیا۔ عثمانی سلطنت کے بانی عثمان کا تعلق بھی ایک اوغوز ترک قبیلے سے تھا۔ اناطولیہ اور ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں کے وارث کے طور پر ترک سردار عثمان نے ۱۲۹۹ء میں قدم جمائے اور ایک ایسی عظیم سلطنت (عثمانی خلافت) کی بنیاد رکھی جو صدیوں تک ایشیاء اور یورپ کے متعدد علاقوں اور ممالک پر حکمرانی کرتی رہی۔ اوغوز ترکمنوں کی دو اور مملکتیں قفقاز اور ایرانی علاقوں میں قائم ہوئیں جن کی یادگار آج کی آذربائیجانی قومیت ہے۲۷۔

اوغوز ترکوں کے وسطی ایشیا میں باقی رہ جانے والے قبائل گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں خراسان اور خوارزم (خیوا) کے علاقوں میں آباد ہوگئے۔ منگولوں کی یلغار کے نتیجے میں خوارزم اور جزیرہ نمائے مانگیشلاک کے شمالی علاقوں کے ترکمن باتو خان (اور لشکر زرین) کے زیر نگیں ہوگئے جبکہ ترکمنوں کے جنوبی علاقے تیموری سلطنت کے حصے قرار پائے۔ لشکر زریں اور تیموری سلطنتوں کے زوال کے بعد بخارا، خیوا اور ایران نے ترکمن علاقوں کے حصے بخرے کیے۲۸ تاہم سرحدی علاقوں کے ترکمنوں نے اپنی آزادی اور استقلال کو برقرار رکھا اور اپنے دفاع کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً بالادستی کے لیے برسرپیکار تینوں پڑوسی ریاستوں میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ اتحاد و تحالف کی پالیسی پر گامزن رہے۔ سرداری نظام اور قبائلی طرز زندگی کی بنا پر ترکمن اس علاقے میں اپنی کوئی مستقل مملکت تشکیل دینے میں ناکام رہے۔ سولہویں صدی کے بعد سے ترکمنوں کی علاقائی حدود ایک متعین صورت میں ظاہر ہونے لگیں۔ ان علاقائی حدود میں موجودہ ترکمنستان اور ایران و افغانستان کے شمالی علاقے شامل ہیں۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں روسیوں کی اس علاقے میں پیش قدمی کے وقت ترکمن قبائل ٹیکے ۔ ترکمن (Teke – Turkmen) قبیلے کی سربراہی میں ایک متحدہ ریاست کی تشکیل کے عمل سے گذر رہے تھے۔ تاہم روسیوں کی اس علاقے میں پیش قدمی اس عمل کی تکمیل میں حائل ہوئی۲۹۔

روسیوں کی ترکمن علاقوں کی طرف پیش قدمی کی ابتداء بحیرہ کیسپین کے مشرقی ساحل پر کراسنو ووڈسک کے مقام پر قبضے سے ہوئی۳۰۔ کراسنو ووڈسک پر قبضہ کرنے والی روسی افواج کی سربراہی جنرل راڈٹسکی کررہے تھے۔ روسیوں نے اس مقام پر ایک قلعہ تعمیر کیا اور اس قلعے میں

مقیم روسی افواج کی کمان کرنل سٹولیٹوف کے سپرد ہوئی۔ روسیوں کے پیش نظر دریائے آمو اور ایران کے سرحدی علاقون کے مابین رہنے والے ترکمن قبائل کے علاقوں اور خانیت خیوا پر قبضے کے ذریعے ترکستان (وسطی ایشیا) کو یورپ کے ساتھ بحیرہ کیسپین کے مشرقی سواحل کے ذریعے براہ راست ملانا تھا۔ روسیوں کے پیش نظر ایک اور مقصد یہ تھا کہ ایرانی سرحدوں کے ساتھ ساتھ مرو اور ہرات کی طرف پیش قدمی کو آسان بنایا جائے تاکہ برطانیہ کے زیرنگین ہندوستان کی سرحدوں کے نزدیک ترین پہنچا جاسکے۔ بہرحال اس وقت انگلستان کی حکومت روسیوں کے اس منصوبے کا ادراک کرنے سے قاصر رہی۳۱۔ ۲۴ اگست ۱۸۷۳ء کو خیوا پر قبضے کے بعد روسیوں اور خیوا کے خان محمد رحیم کے مابین "معاہدہ امن" پر دستخط ہوئے۔ اس معاہدہ کی رو سے خیوا کو عملاً" روسیوں کی عملداری میں دے دیا گیا۔ مزید یہ کہ اس معاہدے کے مطابق خیوا کے خان کو تاوان جنگ کی مد میں ۲۲ لاکھ روبل ماسکو کو ادا کرنے کا پابند بنایا گیا۔ رحیم خان نے یموت ترکمنوں کی سرکشی کی شکایت کرتے ہوئے فاتح روسی جرنیل کاوفمان یا کوفمان' (انگریزی : Kaufmann) سے درخواست کی کہ اسے ضبط شدہ توپوں میں سے کچھ واپس کی جائیں تاکہ اسے اپنی رعایا (یموت ترکمنوں) کو تاوان جنگ ادا کرنے پر مجبور کرنے کے لیے ضروری طاقت و قوت حاصل رہے۔ روسیوں نے یموت ترکمنوں سے تاوان جنگ وصول کرنے کی مہم کے بہانے خیوا کے جنوبی علاقوں میں آباد ترکمنوں کے خلاف فوجی مہمات شروع کیں۔ اور چند ماہ کے اندر ہی ہزاوات' کزل تکیار (یا قزل تکیار) اور ایلیالی کے علاوہ سلطنت خیوا میں شامل دیگر علاقوں میں رہائش پذیر یموت ترکمنوں کو یا تو تہہ تیغ کردیا اور یا اپنے علاقے چھوڑ کر جنوب کی طرف فرار ہونے پر مجبور کردیا۳۲۔ ۱۸۷۷ء سے ۱۸۸۸ء تک کے عرصے میں روسیوں نے کزل اروات (یا قزل اروات) یانگی کلہ' دنغیل ٹپے' گوک ٹپے' عشق آباد (جو ٹیکے ترکمنوں کے علاقوں کا مرکزی مقام تھا) اور اناد' قلعے پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۸۱ء سے ۱۸۸۴ء کے عرصہ میں روسیوں نے دریائے اٹریک کے ساتھ ساتھ مشرقی سمت میں مزید پیش قدمی جاری رکھی اور مرو تک کے ترکمن علاقوں (سرخس' پنڈے اور مرو) پر قبضہ مکمل کر لیا۔ ۱۸۹۹ء میں روسیوں نے بحیرہ کیسپین کے ساحلی علاقے پر مشتمل ضلع "ٹرانس کیسپیا" ترکستان میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۱۶ء میں روس کے زیر انتظام دیگر مسلم علاقوں اور قومیتوں کی طرح ترکمنوں نے بھی ماسکو کی طرف سے ان کی فوج میں غیر حربی پیشوں میں خدمات انجام دینے کو ضروری قرار دینے کے خلاف بغاوت میں حصہ لیا۳۳۔ ۱۹۱۷ کے بالشویک انقلاب کے بعد ۳۰ اپریل ۱۹۱۸ء کو ترکمن خود مختار جمہوریہ کی تشکیل کا اعلان کیا گیا۔ ٹرانس کیسپیا کو اس خود مختار جمہوریہ میں شامل رکھا گیا اور ترکمن جمہوریہ روسی

فیڈریشن کی ایک خود مختار جمہوریہ قرار پائی۔ جولائی ۱۹۱۸ء میں تر کمن قوم پرستوں نے (جن میں منشویک اور دائیں بازو کے سوشل ڈیمو کریٹ شامل تھے) بالشویک اقتدار کا خاتمہ کرکے آزادی کا اعلان کردیا۔ عشق آباد کی اس نو آزاد تر کمن ریاست کو مشہد (ایران) میں قائم برطانوی مشن کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس نو آزاد حکومت کی درخواست پر جنرل میلیسن کی قیادت میں برطانوی فوجی دستے عشق آباد میں تعینات کئے گئے۔ بہرحال تر کمن اپنی یہ آزادی زیادہ دیر تک برقرار نہ رکھ سکے اور انگریزی افواج کے انخلاء کے بعد ۱۹۲۰ء کے اواخر تک علاقے پر جنرل فرنز اور کجبائی شیف کی قیادت میں سرخ افواج نے اپنی گرفت مستحکم کر لی۔ تر کمنستان کو ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو یونین جمہوریہ (SSR) کی حیثیت دی گئی اور اس میں ٹرانس کیسپین ڈسٹرکٹ کے علاوہ عشق آباد، کراسنووڈسک، تیجند، مرو اور سابقہ خیوا اور بخارا خانیتوں کے تر کمن علاقے (خیوا کے تاشاوز اور ارگنج علاقے اور بخارا کے چار جڑؤ اور کرکی کے علاقے) شامل کئے گئے۳۴۔

قازقستان کی زمینی سرحد اگرچہ ایران کے ساتھ نہیں ملتی تاہم بحیرہ کیسپین کا ساحلی ملک ہونے کے ناطے ان دونوں کی بحری حدود ایک ہی بحیرہ سے منسلک ہیں۔ وسطی ایشیا کی باقی تین مسلم ریاستوں: ازبکستان، تاجکستان اور کرغیزستان کے ساتھ ایران کا براہ راست جغرافیائی اتصال نہیں البتہ تر کمنستان کے راستے ازبکستان اور پھر ازبکستان کے راستے تاجکستان، کرغیزستان اور قازقستان کے ساتھ بھی زمینی روابط پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ مسلم ممالک کی حیثیت سے ایران ان تمام ریاستوں کے ساتھ مشترک مذہبی اور ثقافتی ورثے کے حوالے سے مضبوط بنیادوں پر تعلقات استوار کرنا چاہتا ہے۔

ایران اور سابق سوویت ریاستوں میں روابط: دوطرفہ یا کثیرالاطراف؟

۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کے انہدام کے نتیجے میں ایران کے پڑوس میں متعدد مسلم اور غیر مسلم نو آزاد ریاستوں کے عالمی نقشے پر ظہور کے وقت صدر علی ہاشمی رفسنجانی کی حکومت ایران کی سفارتی تنہائی (diplomatic isolation) کے خاتمہ کے لیے زبردست کوششوں میں مصروف تھی۔ ۱۹۷۹ء کے اسلامی انقلاب کے نتیجے میں نہ صرف امریکہ اور مغرب سے ایران کے تعلقات بگاڑ کا شکار ہوگئے تھے بلکہ بعض اسلامی ممالک میں بھی بوجوہ ایران کے لیے ناپسندیدگی کے جذبات پیدا ہوگئے تھے۳۵۔ عراق اور ایران کے درمیان جنگ چھڑنے کے نتیجے میں "بین الاقوامی برادری" کی طرف سے ایران پر "مکمل سفارتی تنہائی" عائد کردی گئی۔ یہ سفارتی تنہائی عملاً" ۸۰ کی دہائی کے اختتام تک جاری رہی۔ اس پس منظر میں ایرانی انقلابی قیادت نے ۸۰ کی دہائی کی ابتداء ہی سے اس سفارتی تنہائی کو توڑنے کے لیے لچک دار خارجہ پالیسی اختیار کرنا شروع کی۔ اکتوبر ۱۹۸۲ میں